لنڈی کوتل کی لالٹین

سجاد اظہر



پرانی اصناف کی نسبت اردو میں نثری نظم اب بھی ارتقا پذیر ہے اگرچہ اس میں افضال احمد سید جیسے جید شعرا پیدا ہو چکے ہیں۔ چنانچہ سجاد اظہر کا یہ مجموعہ ہماری نثری نظم اور جدید شاعری کے موجودہ سرمائے میں ایک اہم اضافہ ہے۔ سادگی، بے باکی، چست پیرایۂ اظہار اور گہرا عصری شعور ان کے کلام کو بامعنی بناتے ہیں۔ مگر اس عصری شعور کی آبیاری محض حالاتِ حاضرہ نے نہیں بلکہ تاریخ کی تفہیم نے کی ہے۔ کسی ادب پارے کا قاری کو چونکا دینا کافی نہیں ہوتا۔ سجاد اظہر کی نظمیں صرف چونکاتی نہیں، اپنے اندر گہرائی کو ماپنے اور باہر دور تک دیکھنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ "ہم قرطبہ میں ہیں" کا سبب آج پھیلی ہوئی وبا نہیں بلکہ وہ وجودی جبر ہے جو از آدم تا ایں دم جاری ہے اور وہ معاشی جبر جو ایک فیصد انسانوں نے ننانوے فیصد پر مسلط کر رکھا ہے۔ یہ وجودی اور معاشی جبر ہمیں زنجیریں کھونے نہیں دیتے اور کائنات پانے نہیں دیتے۔ سجاد اظہر نے ایک بار پھر ہمیں جھنجھوڑا ہے۔

حارث خلیق

لنڈی کوتل کی لالٹین

سجاد اظہر

لنڈی کوتل کی لالٹین

سجاد اظہر

مثال پبلشرز
رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

اشاعت : 2021

کتاب : لنڈی کوتل کی لالٹین

شاعر : سجاد اظہر

ناشر : محمد عابد

تزئین : رانا رضوان

قیمت : 400 روپے

مطبع : سلیم نواز پرنٹنگ پریس

Landi Kotal Ke Laltain

Poet

Sajjad Azhar

Edition 2021

اہتمام

مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد
+92-41-2615359, 2643841, Cell:+92-300-6668284
email: misaalpb@gmail.com

شو روم

صابریہ پلازہ، گلی نمبر 8، منشی محلہ، امین پور بازار، فیصل آباد

رُوحہ، عیشا اور سبحان کے نام

اور آنے والے کل کے نام

جو ہر روز اُمید بن کر طلوع ہوتا ہے

فہرست

❑ انوکھی نظمیں	ڈاکٹر انجم بارہ بنکوی	11
❑ صدیوں کی نبض پر ہاتھ رکھنے والا شاعر	حسن مجتبیٰ	14
❑ میں نظمیں کیوں لکھتا ہوں؟	سجاد اظہر	17
❍ بیانیہ		19
❍ لنڈی کوتل کی لالٹین		20
❍ ماڈرن کنزیومر		22
❍ محبّت کی دیوی		23
❍ آزادی		24
❍ شہرِنو کی مسافت		26
❍ آخری نمازی		27
❍ ہم قرنطینہ میں ہیں		28

- ۲۰۱۸ء کی آخری نظم 30
- فالٹ لائینز 31
- اے میری مارگلہ 32
- بناناری پبلک 34
- موہنجودڑو 35
- جنون 36
- ٹائم لائن 38
- اکلاپا 39
- گِدھ 40
- فِفتھ جنریشن وار 42
- مِسنگ پرسنز 43
- ایک نظم حامد میر کے لیے 44
- سٹون ایج 46
- بندہ بشر 47
- اندھوں کی گواہی 48
- راوی 50
- اپنی سالگرہ پر ایک نظم 51

- کربلا 52
- ماضی 54
- بلیک ہولز 55
- ہمارے پاؤں ننگے نہیں ہیں 56
- نرگسیت 58
- چرخہ 59
- خشوگی کے لیے ایک نظم 60
- ٹاک شو 62
- آگ کا دریا 64
- بے زیست لمحے 65
- آزادیِ اظہار 66
- مغالطہ 68
- ویلنٹائن ڈے 69
- ٹریل فائیو 70
- خطبہ 72
- تیسری دنیا 73
- دو وطن 74

- ٹلہ جوگیاں 76
- پُل صراط 78
- دیہاڑی دار 80
- المیہ 82
- زاویۂ نظر 83
- یہ جو دہشت گردی ہے 84
- آؤ جانور بن جائیں 86
- چوراہا 88
- امن کی آشا 89
- محبّت کی ایک نظم 90
- لاک ڈاؤن 92
- جزدان میں لپٹے صحیفے 94
- سالِ نو پر ایک نظم 96
- فیض آباد دھرنا 98
- فاصلے ایسے بھی ہوں گے 99
- عجب اپنا یہ دیس ہے 100
- اجنبی راستے 102

انوکھی نظمیں

سجاد اظہر حرف و لفظ کی حرمت صدا فلاک کے امانت دار ہیں انہیں یہ سلیقہ اور شعور ہے کہ لفظوں میں بینائی کیسے پیدا کی جاتی ہے، اس لیے جب یہ شاعری کرتے ہیں تو اپنے وجود کی تمام تر طہارت کے نور کو بروئے کار لاتے ہیں اور جب خبر نگاری کرتے ہیں تو خوشبوئے صداقت کاغذ کے طول و عرض پر چھڑک دیتے ہیں۔ انہیں یہ کمال اس لیے بھی آتے ہیں کہ یہ محبّت کی دائمی بہار خوش آثار سے مہکتے دمکتے رہتے ہیں۔ سجاد اظہر کو امکان بھر جاگتی آنکھوں سے دنیا دیکھنے کا شوق و جنون ہے۔ یہ شوق فاصلوں کو قربتیں عطا کرتا ہے اور قربتوں میں ایک حیات بخش شدت کا اضافہ۔

ان کی دوست داریوں، فیاضیوں کا قصیدہ بھی سلیقے سے لکھا جا سکتا ہے۔ میرے دوست اور کرم فرما ڈاکٹر نورامروہوی جس محبّت اور خلوص سے ان کی حرف شناسی کے سلسلے میں رطب اللسان رہتے ہیں وہ قابلِ رشک ہے۔ ڈاکٹر نورامروہوی کے توصیفی کلمات پر ایمان نہ لانا میرے نزدیک کفر ہے، انہی کے توسط سے سجاد اظہر کی کچھ نظمیں پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ نظموں کے معاملے میں میرا نظریہ ذرا مختلف ہے، میں خود صرف اور صرف غزل میں ہی اپنی عافیت سمجھتا ہوں، مگر نظم میں اپنے جوہر و کمال دکھانے والوں کی تعریف دل سے کرتا ہوں بلکہ اگر کچھ قابل اعتراض بھی ہوتا ہے تو درگزر کر دیتا ہوں۔

اعتراض چاہے اسلوب کی سطح کا ہو، زبان و بیان کی سطح کا ہو یا موضوع کا مگر میں چادرِ خاموشی اوڑھ لیتا ہوں، یہ ضرور ہے کہ صرف نظم کہنے یا لکھنے والے شاعروں سے عروضیے یعنی فعلن فعلن کی گردان رٹنے والے خاصے پریشان رہتے ہیں، یہ بیچارے جن کے یہاں پان کھانے تک میں کوئی ندرت نہیں ہوتی، ساری زندگی حاشئے پر قافیے لکھ لکھ کر مصرعے کے کارِ بے مصرف میں خرچ ہوتے رہتے ہیں، انہیں خبر ہی نہیں کہ یہ عہد بال سے مہین تار کے چھید سے دنیا کے نشیب و فراز دیکھنے میں لگا ہوا ہے۔ یہ سجاد اظہر کی نظمیں کیسے پڑھیں گے، کیسے سراہیں گے۔ ہاں سجاد اظہر کی نظمیں جو پڑھتے ہیں انہیں مسرت ہوتی ہے کہ معاشرتی تضادات کو شعری پیکر کیسے عطا ہوتا ہے۔ امن کے نغمے کیسے گائے جاتے ہیں، خود انحصاری کے جذبے کیسے پروان چڑھتے ہیں، شگفتگی اور تازگی کا نور فضاؤں میں کیسے بکھرتا ہے، موضوعات کا تنوع کیا ہوتا ہے، اسلوب کا عطر کسے کہتے ہیں، لہجے کی شبنم سے کاغذ کیسے نم ہوتا ہے۔ دیکھئے ایک نظم ہے ''محبّت کی دیوی'' اس طرح کی نظمیں لکھنے کے لیے جس حاضر دماغی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ سجاد اظہر میں اپنے پورے جلال و جمال کے ساتھ موجود ہے۔ یہ نظم ایک کلائمکس پر ختم ہوئی یعنی ''مندروں سے جھنکار کی آوازیں تو آتی رہیں'' مگر نظم کا Reclimax ہوا اس جگہ ''مگر محبّت کی کوئی آواز نہیں آتی''

میں آپ کو یہ بتانے میں شاید کامیاب ہو جاؤں کہ سجاد اظہر کے یہاں بہت کچھ دوسروں سے خاصا مختلف ہے، غیر متوقع ہے، ان کی نظمیں نئی، انوکھی اور فکر انگیزی کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ ایک بات اور نئی اور چونکانے والی ہیں کہ ان کے یہاں کوئی منصوبہ بندی کیا اس کا شائبہ بھی نہیں۔ اب یہ ہوگا تو یہ کریں گے، یہ ہوگا تو یہ کریں گے، اندیشوں سے پرے اپنی دھن میں رچے ہوئے فنکار ہیں سجاد اظہر۔ جب بھی خیال کی پریاں سج سنور کر ان کے سامنے آتی ہیں، یہ ان کی تصویر پکی روشنائی سے کاغذ پر اتار دیتے ہیں۔ یہی کمال انہیں دوسروں سے سربلند کرتا ہے۔ ان کی ایک بہت ہی انوکھی نظم ہے۔

آزادی
سرحدیں سر مانگتی ہیں
اوران کے بیچ پروان چڑھنے والی نسلیں
ایک پرامن گھر مانگتی ہیں

یہ نظم پڑھنے سے تعلّق رکھتی ہے، مجھے یہ عرض کرنے میں کوئی خوف نہیں کہ سجاد اظہر کی نظموں کی کائنات دور تک روشن اور منور ہے، چونکہ نظم تا دمِ تحریر اصلاحِ معاشرہ کے حوالے سے سب سے زیادہ کارآمد صنف شمار کی گئی ہے۔ نظم کی یہی افادیت کبھی غزل پر فوقیت پا جاتی ہے۔ سجاد اظہر کی بیشتر نظموں میں ایک تعمیری مقصدیت نمایاں اور روشن نظر آتی ہے۔ نیز اصلاحی پہلو ہیرے موتی کی طرح اپنی پوری توانائی کے ساتھ جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ ان کی نظم ''صنم کدہ'' پڑھیں یا ''شہرِ نو کی مسافت'' پڑھیں یا ''جنون'' پڑھیں یا ''2018ء کی آخری نظم'' غرض کوئی سی بھی نظم پڑھیں، آپ ایک نقطہ بھی انحطاط کا نہیں نکال سکتے۔ ایک سر بلندی کے ساتھ آپ کو سجاد اظہر نظر آئیں گے۔ یہی ان کا امتیازی وصف ہے، یہ بارہا حالات کی ستم ظریفی پر کڑھتے ہیں اور کچھ سخت کلامی بھی کرتے ہیں۔

ان کے تمام تر شعری کمالات ان کے احساس اور جاں سوز طبیعت کا آئینہ ہیں۔ مجھے یقینِ واثق ہے کہ سجاد اظہر ریاستِ حرف ولفظ میں اپنی ریاضت وبصیرت سے سندِ اعتبار حاصل کرلیں گے۔

ڈاکٹر انجم بارہ بنکوی
مدھیہ پردیش اوپن یونیورسٹی
بھوپال، انڈیا

صدیوں کی نبض پر ہاتھ رکھنے والا شاعر

حیرت، آگہی، احتجاج، قدیم اور جدید کے اوراق میں لپٹے احساسات، یہ ہیں چار عناصر ہیں جو سجاد اظہر کی شاعری کی تشکیل کرتے ہیں۔ اگر چہ اس کی شاعری نثری نظم اور آزاد نظم کی شاعری ہے لیکن نظم آزاد ہو کہ عروض کی گرائمر میں پابند، اچھی نظم لکھنا کوئی آسان کام نہیں کہ یہ شکرے کو اپنی بوٹیاں کھلانا ہوتا ہے۔ سجاد اظہر کی نظمیں بظاہر نثری ہیں لیکن ان میں ایک موسیقیت ہے، جو کانوں سے زیادہ آپ کے دل کے تاروں کو چھیڑ لیتی ہے۔ بالکل ایسی موسیقیت جو دریائے اٹک میں ہے اور ایسی خوبصورتی جو وادیٔ سون کی ہے اور ایک نمکیت جو بقول گلزار عشق میں ہوسکتی ہے۔ سالٹ رینج نے صرف سپاہی ہی پیدا نہیں کیے شاعر، سادھو، سالک، صوفی، سنت، فقیر اور عاشق بھی پیدا کیے ہیں۔

سجاد اظہر نے نیو یارک کی نام نہاد دنیا، اردو ادبی دنیا میں دبنگ انٹری ماری تھی۔ وہ ایک بہت بڑی حیرت کا عنصر لے کر اپنے ساتھ آیا تھا جب اس نے اپنی پہلی نظم حلقہ اربابِ ذوق نیو یارک کے ایک اجلاس میں پڑھی تھی جہاں وہ اس سے پہلے بطور صحافی حلقے کے پندرھواڑے اجلاسوں میں باقائدہ شرکت کیا کرتا تھا۔ مجھے پہلے ہی پتہ تھا اس لڑکے میں میری طرح ایک صحافی کی آنکھ اور شاعر کا دل ہے۔ اسی لیے میں اسے پوٹھوہار کا حسن مجتبیٰ کہتا ہوں۔ ایسے کہوں کہ حسن مجتبیٰ کا ایڈٹ شدہ ورژن۔

پتہ نہیں مجھے کیوں لگتا ہے کہ سجاد جیسے دل اور آنکھ رکھنے والے بندے یا بندیاں اسی سجاد اظہر کے ریجن میں سینتیس ہزار سالہ پرانا وہ پہلا انسانی ہاتھ ہیں جو سائنسدانوں کو دریافت ہوا تھا۔ یا پھر یہ لوگ اسی پہلے ارتقائی انسانی ہاتھ کے اصلی وارث ہیں جنہوں نے قلم اپنے ہاتھ میں اٹھا لیا ہوا ہے۔ جیسے اسی کتاب میں سجاد اظہر نے بھی کہا ہے انہوں نے اب تیروں بھالوں کی جگہ قلم اٹھایا ہوا ہے۔ چونکہ میں انسان کے جنت سے نکالے جانے پر نہیں، انسانی ارتقا کی تھیوری پر یقین رکھتا ہوں تو نیک روشن رہے کہ دو پیروں والے اس جانور کو سماجی بننے میں بھی کئی ہزاروں سال لگے۔ جب اس نے ہزاروں سال قبل ہاتھوں کا استعمال اور ان سے روزمرہ کے کام یعنی شکار کرنا اور شکار جمع کرنا سیکھا۔ جب اسے بار بار ہاتھ دھونے کی فکر بھی نہیں ہوا کرتی تھی۔ انسان شروع سے ہی خطروں کو مواقعوں یعنی تھریٹس کو آپرچونٹی میں بدلتا آیا ہے تو سجاد نے بھی ایسا ہی کیا۔ کچھ دنوں جب اسے قرنطینہ میں جانا پڑا تو پھر اس کی واپسی شاعری کی کتاب سے ہوئی۔ وہ پہلے ہی صدیوں زمانوں کی نبض پر ہاتھ رکھنے والا شاعر ہے۔ سجاد اظہر کی شاعری کے اس مجموعے کی پہلی ہی نظم ''لنڈی کوتل کی لالٹین'' حیرت ناک طور پر دل کو نمک کی ڈلی میں بدلنے کا جادو رکھتی ہے۔ ''جنمی'' شاعر ہو تم سجاد بھائی!

اس زمانے میں
لنڈی کوتل سے آگے
زمینیں آگ اُگل رہی تھیں
لنڈی کوتل میں بھی اب جرمنی کی لالٹینوں کی جگہ
امریکی بندوقوں کی دُکانیں کھل گئی تھیں
جنہیں چلانے کی ڈگریاں
مدرسوں سے ملتی تھیں

اسی طرح سجاد کی ایک اور نظم ''اے میری مارگلہ'' ہے:

ہندوکش کی طرح تیری شان ہے
نہ قراقرم کی طرح تیری ہیبت
نہ تو ہمارے لیے کوہِ طور کی طرح متبرک
مگر پھر بھی تو دلرُبا ہے

یہ اس کی اپنی دھرتی کے ساتھ محبّت کی حد ولاحد ہے۔ جو بات سجاد اظہر کی شاعری کو نمایاں و منفرد کرتی ہے وہ ہے اس کے موضوعات اور ان کے پیچھے تاریخی شعور کی بہتی دھارائیں۔ وہ ایک ایسا شاعر ہے جس کی شاعری میں عشق و حسن تو ہے ہی لیکن ایک للکار ظلم، سماجی و تاریخی ناانصافیوں کے خلاف مظلوم کی طرفداری کی بھی ہے۔ اسی طرح نہ وہ روایتی شاعر ہے نہ اس کی شاعری روایتی گل و بلبل کی شاعری۔ وہ اپنی ایک نظم میں کہتا ہے:

سرحدیں سر مانگتی ہیں
اور ان کے بیچ پروان چڑھنے والی نسلیں
ایک پرامن گھر مانگتی ہیں
جہاں بھوک نہ ہو ننگ نہ ہو
کسی منبر اور مندر پر نفرت کا رنگ نہ ہو
کسی ذی رُوح پر حیات تنگ نہ ہو
سرحدوں پر کوئی جنگ نہ ہو

سجاد بڑے خواب مصور کرنے والا ایک بڑے کینوس کا شاعر ہے۔ مزید خود کتاب اور اپنے اندر ملاحظہ کریں:

حسن مجتبٰی
نیویارک

میں نظمیں کیوں لکھتا ہوں؟

یہ ستمبر 2011ء کی بات ہے، نیویارک میں Occupy Wall Street کے نام سے ایک تحریک شروع ہوئی۔ مظاہرین کئی روز تک ذکوٹی پارک میں دھرنا دیے بیٹھے رہے جن کا نعرہ تھا ہم 99 فیصد ہیں۔ مطلب یہ کہ 99 فیصد کی قسمت کے فیصلے ایک فیصد ایلیٹ کلاس کے ہاتھ میں ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف یہ تحریک مجھے بھا گئی۔ پہلے کوریج کی غرض سے اور بعد ازاں ذہنی رغبت کی وجہ سے ہر شام وہاں گزارتا۔ یہ تحریک بھرپور تھی مگر کامیاب نہ ہو سکی لیکن اس نے امریکی اور باہر کی دنیا کو کافی متاثر کیا۔ صفِ اوّل کا میڈیا بھی اب یہ کہنے لگا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام نے امریکی عوام اور دنیا کو یرغمال بنایا ہوا ہے۔ برسوں پہلے میں نے اس پس منظر میں ایک نظم لکھی تھی ''سٹون ایج''۔ بعد میں میری شاعری، اُن حالاتِ حاضرہ کی نظر ہو گئی جنہوں نے ہمارے اندر اور باہر کی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ یہ نیویارک میں مقیم صحافی دوست حسن مجتبیٰ تھے جو خود بھی صحافت کے ساتھ ساتھ انقلابی نظمیں لکھا کرتے تھے انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔ 2019ء کا سال پاکستان میں آزادی اظہارِ رائے کے لیے کئی چیلنجز لایا۔ اسی سال میں نے کالموں اور بلاگ کے ساتھ نظموں کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا، زیادہ تر نظمیں اسی سال لکھی گئیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ دل کی بات کرنے کا زیادہ بہتر قرینہ شاعری ہی ہے۔ 28 سال پہلے میں صحافت کے پیشے

سے وابستہ ہوا تھا۔ آج حالاتِ حاضرہ کی جانکاری کے بعد مجھ پر کھلا ہے دنیا ویسی نہیں جیسی دکھتی ہے، علم وہ نہیں جو نصابوں میں ہے، خبر وہ نہیں جو اخباروں میں چھپتی ہے، منظر وہ نہیں جسے ہماری آنکھیں دکھلاتی ہیں اور زندگی وہ نہیں جو ہم گزارتے ہیں۔ یہ ایک پُراسرار جہان ہے اپنی ذات کے اندر بھی اور باہر بھی، کھوج کرید کا سفر جاری ہے۔ لیکن ہم حقیقت سے اتنے ہی فاصلے پر ہوتے ہیں جتنے ہم قرنطینہ میں رہ کر باہر کی دنیا سے دور ہوتے ہیں۔ اندر جب انہونیوں کا خوف ہوگا تو باہر موجود دُکانوں پر لالٹینیں نہیں بندوقیں ہی بکیں گی اور ہمارے روشن دانوں سے روشنی اور تازہ ہوا نہیں بارود کا دھواں ہی آئے گا۔

سجاد اظہر

اگست 2021ء

وٹس ایپ: 0300-0127237

بیانیہ

میں ایسے صحرا نوردوں میں رہتا ہوں
جہاں پانی کی تلاش جرم ٹھہرتا ہے
بھوک سے نڈھال
اور پیاس سے بلکتے بچوں کو
یہ وعظ سنایا جاتا ہے کہ
جس کسی نے تم پر لشکر کشی کی
وہ صحرا کی وسعتوں کی خاک ہو گیا
تم آج بھی آزاد ہو
جس کا گواہ یہ صحرا ہے
یہ پیاس ہے
اور اس میں ناچتی یہ بھوک ہے

لنڈی کوتل کی لالٹین

ہاتھوں میں کاغذ کی ڈگریاں تھامے
ہم نے کتنے ہی دفتروں کے پتے ازبر کر لیے
مگر نوکری نہیں ملی
لنڈی کوتل کی لالٹینوں کی روشنی میں پڑھتے پڑھتے
ہماری بینائی تو سلامت رہ گئی
مگر سونگھنے کی حس کو
لالٹینوں میں جلنے والے تیل نے متاثر کیا
جس سے ہماری سوچنے کی حس کم اور سُونگھنے کی تیز ہوگئی
اس زمانے میں
لنڈی کوتل سے آگے
زمینیں آگ اُگل رہی تھیں

لنڈی کوتل میں بھی اب جرمنی کی لالٹینوں کی جگہ
امریکی بندوقوں کی دُکانیں کھل گئی تھیں
جنہیں چلانے کی ڈگریاں
مدرسوں سے ملتی تھیں
نوکری کے لیے ہماری ڈگری تو کام نہیں آئی
البتہ آگ سُونگھنے کی صلاحیت ہمیں اخباروں میں لے گئی
جہاں باقی زندگی ہم نے
آگ اُگلتی سُرخیاں نکالنے میں گزار دی

ماڈرن کنزیومر

اندھیری غاروں میں خوف وہ پہلی چیز تھی
جسے انسان نے اپنے اندر دریافت کر لیا تھا
آنے والے وقتوں میں جتنی تخلیقات ہوئیں
وہ اس ایک دریافت کو مٹانے کے لیے تھیں
مگر ہر چیز ایک نیا خوف لے کر آتی
پھر طے ہوا کہ
خوف کو ختم کرنے کے بجائے
کیوں نہ اسے پھیلایا جائے
اور مارکیٹ کیا جائے
آج دنیا میں خوف سب سے بڑا کاروبار ہے
اور ہر کوئی
اپنی اپنی حیثیت کے مطابق
اسے خرید رہا ہے، بیچ رہا ہے

محبّت کی دیوی

ہزاروں سال پہلے جب
انسان نے پوجا شروع کی
تو اس نے دیوتا نہیں دیویاں بنائی تھیں
مگر ایک روز مرد کی مردانگی جوش میں آئی
اور اس نے دیوتا تراش ڈالا
جس نے تمام دیویوں کو
مندروں کی چار دیواری کی زینت بنا دیا
اس کے بعد
مندروں سے جھنکار کی آوازیں تو آتی رہیں
مگر محبّت کی کوئی آواز نہیں آئی

آزادی

سرحدیں سر مانگتی ہیں
اوران کے بیچ پروان چڑھنے والی نسلیں
ایک پرامن گھر مانگتی ہیں
جہاں بھوک نہ ہو، ننگ نہ ہو
کسی منبر اور مندر پر نفرت کا رنگ نہ ہو
کسی ذِی رُوح پر حیات تنگ نہ ہو
سرحدوں پر کوئی جنگ نہ ہو
یہ ہم بھی چاہتے ہیں یہ تم بھی چاہتے ہو
مگر یہ ممکن بھی کیسے ہو
جب آگ اُگلتی فیکٹریاں
تعصّب کے ایندھن سے چلتی ہوں

اور یہ تعصّب
اِدھر بھی ہے اور اُدھر بھی ہے
نفرت کے شعلوں سے بھسم تم بھی ہو
راکھ ہم بھی ہیں
بارود بیچنے والے ساہوکار کے آگے
نسلیں ہم دونوں کی گروی ہیں
بظاہر آزاد تم بھی ہو اور ہم بھی ہیں

شہرِ نو کی مسافت

شہر قدیم کے دروازے
پستہ ضرور تھے
مگر کُشادہ تھے
شہرِ نو کے دروازے بہت اونچے ہیں
مگر ان کے پیچھے ایسے
کوتاہ قامت بستے ہیں
جو ہر بلند قامت کا
پہلے راستہ روکتے ہیں
پھر اس کی گردن اتارتے ہیں
اور آخر کار ان پستہ دروازوں سے
اس کی بوری بند لاش لڑھکا دیتے ہیں

آخری نمازی

میں شہر کی بھری مسجد کا
آخری نمازی ہوں
جو سب سے آخر میں مسجد سے نکلتا ہے
اور ننگے پاؤں گھر جاتا ہے
خدا کا شکر بجالاتا ہوں
جوتے نئے آ جائیں گے
جاں تو سلامت ہے
کیونکہ اب جوتے چوروں کے پیچھے پیچھے
خودکش حملہ آور بھی
مسجدوں میں آ جاتے ہیں

ہم قرنطینہ میں ہیں

جس روز کاغذ ایجاد ہوا تھا
اس روز دنیا سے اعتبار اٹھ گیا تھا
لوگ اب روایتوں کے بجائے
لکھے ہوئے مستند حوالے مانگتے تھے
آٹے کے بدلے کپڑا نہیں دیتے تھے
بدلے میں روپیہ مانگتے تھے
نیکی کو دریا میں ڈالنے کے بجائے
اس کا دام طلب کیا جاتا تھا
اور جو دام نہیں دے سکتا تھا
اس کا لاک ڈاؤن کر دیا جاتا تھا
حد تو یہ بھی تھی کہ سب عبادتیں بھی

کاغذ کی محتاج کر دی گئی تھیں
اس سے پہلے کہ کاغذی انسان
خدا کی حیثیت بھی کاغذی کر دیتا
خدا نے فیصلہ کیا کہ وہ دنیا میں
اپنے گھر کو تالا لگا دے
اور اس کاغذی دنیا کو
قرنطینہ میں ڈال دے

۲۰۱۸ء کی آخری نظم

آدم جب جنت سے نکالے گئے
تب زمین پر شاید
خزاں کا موسم تھا
اس کے بعد کئی بہاریں آئیں
مگر آدمی کا مقدر
خزاں رسیدہ ہی رہا
وہ انہونیوں کا غم پالے
پت جھڑ کے پتوں کی مانند
اپنی ذات میں گرتا رہا
زمیں میں گلتا سڑتا رہا
کیلنڈر کے صفحات پر موسم بدلتے رہے
مگر آدمی کی تاریخ
دسمبر سے آگے نہیں گئی

فالٹ لائنیز

تو قادر و عادل ہے
تیرے بھیجے ہوئے پیغمبروں نے بھی یہی بتایا
کہ تو خیر ہی خیر ہے
مگر تیری اس دنیا میں شر اتنا ہے کہ
ہر وقت ایک ابراہیم کی جستجو رہتی ہے
لیکن جب وہ مل جاتا ہے تو
دنیا اسے آگ میں جھونک دیتی ہے

اے میری مارگلہ

ہندوکش کی طرح تیری شان ہے
نہ قراقرم کی طرح تیری ہیبت
نہ تو ہمارے لیے کوہِ طور کی طرح متبرک
مگر پھر بھی تو بہت دلربا ہے
جب کبھی تیری نیم برہنہ چوٹیاں
برف کی چادر اوڑھ لیتی ہیں تو
گھونگٹ میں لپٹی دلہن کا حسن بھی
تیرے جلووں کے آگے ماند پڑ جاتا ہے
مجھے نہیں معلوم
تیرے حسن اور تیرے نام کے بیچ نسبت کیا ہے
لیکن اتنا پتہ ہے کہ

یہاں ایسے سانپوں کا بسیرا تھا
جو پتھر کو بھی ڈنک ماریں تو وہ چور چور ہو جاتا
کبھی یہاں آدم خور بستے تھے
جو گزرنے والوں کو لوٹتے تو تھے ہی
گلے بھی کاٹ ڈالتے تھے
زمانہ اب بھی نہیں بدلا
اب بھی تیرے دامن میں
سنگ چُور سے زہریلے سانپ پلتے ہیں
اور ایسے آدم خور رہتے ہیں
جو بائیس کروڑ کا خون چوستے ہیں
ہزاروں سال کے بعد بھی لوگ تجھے
مارگلہ کے نام سے ہی پکارتے ہیں
اگرچہ ایک شاعر کو تیرا حسن
دلہن سے بھی دلرُبا لگتا ہے
مگر ایک روز تو اس کا گلا بھی کاٹ ڈالے گی

بناناری پبلک

ہم اپنی محنت کا بویا خوشی سے کاٹ لیتے
مگر اسے المیہ کہیے یا مقدر کہ
ہمارے وہ دانے جنہیں
کھیتوں کا کھلیان بننا تھا
وہ سب اک اک کر کے چڑیاں چگ گئیں
ہمارے حصے میں وہ جڑی بوٹیاں رہ گئیں
جنہیں صاف کریں تو کمریں خم ہو جائیں
اور چھوڑ دیں تو اگلی فصلیں
پھر سے بانجھ ہو جائیں

موہنجوداڑو

دریا ہمیشہ گھاٹیوں میں بہتے ہیں
مگر ان کے کنارے پر آباد تہذیبیں
دریا کے پانیوں کو تسخیر کرنے کے لیے
مخالف سمت میں بہتے ہوئے پروان چڑھتی ہیں
مگر ایک وقت ایسا آتا ہے
جب یہ تہذیبیں دریا کے رخ پر بہنا شروع ہو جاتی ہیں
پھر دریا اپنے کناروں سے باہر آتے ہیں
اور گھاٹے کی شکار تہذیبوں کو
اپنے ساتھ بہا کر لے جاتے ہیں

جنون

میں 1392ء قبل مسیح میں نہیں تھا
لیکن مصر کے بازار گواہ ہیں کہ
عصائے موسیٰ نے
انسانیت کو ڈسنے والے تمام سانپ نگل لیے تھے

میں اس وقت بھی نہیں تھا
جب دو ہزار سال پہلے
سارا القدس مسیح کی گواہی دے رہا تھا

میں 563 قبل مسیح میں بھی نہیں تھا
لیکن میں نے کتابوں میں پڑھا ہے

کہ کپل وستو کے ایک شاہزادے نے
تاج وتخت ٹھکرا کر سنیاس لے لیا تھا
امن اور شانتی اس کا پیغام تھا

میں 571 عیسویں میں بھی نہیں تھا
لیکن میں گواہی دیتا ہوں
مدینے والے کا اسلام
امن اور سلامتی کا دوسرا نام ہے

میں تو 2019ء میں کھڑا ہوں
جہاں میں ہی نہیں تاریخ کا ایک ایک ورق
گواہی دیتا ہے کہ
تیرے پیغامبروں کو بھلا دیا گیا ہے
غزہ کی گلیاں ہوں یا شام کی بستیاں
راکھائن کے گاؤں ہوں یا افغانستان کے شہر
کشمیر کی وادیاں ہوں یا میرا پارہ چنار
ہر جگہ اب خاک وخون ہے
حرص وہوس کے ماروں کا جنون ہے

ٹائم لائن

بیتے ہوئے 50 لاکھ سال کی تاریخ لکھنے بیٹھوں
تو نہ جانے کاغذ بنانے والے
کتنے ہی جنگل سمٹ جائیں
اور کمپیوٹروں کی یادداشتوں پر
کتنے ہی ٹرلین بائٹ کا بوجھ پڑ جائے
مگر اس داستان کو دو حرف میں سمیٹوں
تو بس اتنا کہ
حیوان کا سفر حیوانیت تک پہنچا

اکلاپا

تمہارے اور میرے بیچ
یہ جو فاصلوں کی فصیلیں ہیں
اور ہم دونوں کے خیالات میں
یہ جو مسافتیں ہیں
درحقیقت یہ
سرحدوں کے بیچ
ایسی ریاستیں ہیں
جن کے باشندے
گھٹ گھٹ کر مر رہے ہیں
مگر کوئی دوسرا ملک انہیں ویزا دینے پر راضی نہیں

گِدھ

مدت ہوئی ہے بستی والوں نے
مردار خور گدھ نہیں دیکھے
شاید دور کہیں پہاڑوں میں کوئی آفت آئی
اور وہ خود مردہ ہو گئے
بستی والے اسی گمان میں
اب اپنے مردہ گھوڑوں، گدھوں اور بیلوں کو دفنا دیتے ہیں
اور کسی گدھ کا انتظار نہیں کرتے
حالانکہ
گدھوں کو اب بھی دور کی بستیوں سے
ہر روز مرداروں کی بو آتی ہے
مگر وہ پھر بھی بستیوں کا رخ نہیں کرتے

کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ ان بستیوں میں
اب مرداروں کے نہیں زندہ انسانوں کے لاشے پڑے ہیں
جنہیں ان کے اپنے ہی بھائی
نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں
ان کی ہوس نے
انہیں گدھوں سے بھی بدتر بنا دیا ہے
جو کسی کے مرنے کا انتظار بھی نہیں کرتے

فِفتھ جنریشن وار

میں تجزیہ نگار ہوں
بدلتے جغرافیوں میں رہتا ہوں
اور اس کے لیڈروں کو
دھرتی کے ایک ایک انچ کے لیے
کٹنے مرنے کا عزم کرتے ہوئے سنتا ہوں
مگر سرحدوں کے اندر
بازاروں اور گلیوں میں
مسجدوں اور مندروں میں
لوگ ہر روز کٹ رہے ہیں مر رہے ہیں
جنگ کب کی سرحدوں سے شہروں میں آ چکی ہے
مگر وعظ کے نشانے سرحد پار لگے ہوئے ہیں
نیچے سے زمین روز بروز سرک رہی ہے
جغرافیہ بدل رہا ہے

مِسنگ پرسنز

قدیم صحیفوں میں لکھا ہے
ایک وقت ایسا بھی آیا
جب تخت و تاج بچانے کے لیے
شہر شہر قتلِ طفلاں کی منادی کرا دی گئی
مگر آج کی تاریخ بتاتی ہے
کہ تخت و تاج کی حفاظت کے لیے
طفلوں کو سلامت رکھا جاتا ہے
مگر ان کے باپ مار دیئے جاتے ہیں
کیونکہ آج کے فرعونوں کو یقین ہے کہ
دہشت میں پلنے والی نسلوں کے نیزے
قلعوں کی دیواروں تک نہیں پہنچ سکتے

ایک نظم حامد میر کے لیے

وہ عظیم جنگیں جو کبھی سرحدوں پر ہوتی تھیں
اب ہمارے آنگنوں تک آ چکی ہیں
ان کے خلاف ہمہ وقت پابہ رکاب
ہم وہ شہسوار ہیں، جن کے ہاتھوں میں
نیزوں سے دراز اور تلوار سے تیز دھار والے قلم ہیں
امن، رواداری اور بقائے باہمی ہمارے علم ہیں
مگر زمانہ ہمارے ہاتھ قلم کر دینا چاہتا ہے
وہ خوفزدہ ہے ظلم کے مٹ جانے سے
انصاف کے آ جانے سے
وہ ہمیں ہر قیمت پر مار دینا چاہتا ہے
ہمارے گرد روز بروز عرصہ حیات تنگ ہوتا جا رہا ہے

میں اور میرے لشکر مسلسل نرغے میں ہیں
روح و بدن کے ساتھ کئی سالوں سے جاری
اس معرکے نے ہمیں لاغر ضرور کر دیا ہے
مگر ہمارے حوصلے پست نہیں ہوئے

ہمیں مرنے کی تمنا
بے سر و سامان ہسپتالوں میں نہیں
اور دفن ہونے کی آرزو
انچ انچ کے لیے ترستے قبرستانوں میں نہیں

ہم آزاد ہوا میں لہراتی ہوئی کاٹھیوں پر جان دینا چاہتے ہیں
تا کہ ہمارے نظریات کے گھوڑے
ظلم و ستم سے دہکتی مٹی کو تاراج کر دیں
اور ان کے سموں سے جب ہماری قربانیوں کا خون ٹپکے
تو جنگ زدہ آنگن
سرخ گلابوں سے بھر جائیں

سٹون ایج

شہرِ قدیم کو پتھر کا دور کہنے والو
شہرِ نو سے گزر کر تو دیکھو
کہ ان پتھروں کے لیے
آج کے انسان نے
اپنی زندگی کے
کتنے ہی انمول برسوں کو
مارگیج کی نذر کر دیا ہے

(مارگیج وہ قرضہ جو انسان مکان خریدنے کے لیے لیتا ہے)

بندہ بشر

انسان نے چوپائیوں سے
دوٹانگوں کا فاصلہ
صدیوں نہیں کروڑوں سال میں طے کیا ہے
مگر اب بھی اس فاصلے کو
پاٹنے میں وہ چند لمحے لگاتا ہے
کیونکہ اس کے نہاں خانوں میں
اب بھی وہی جنگل ہیں
وہی گھاٹیاں ہیں
وہی تاریک غاریں ہیں
اور ان میں اس کی وحشت ہے، اکلاپا ہے
اور آسمانی صحیفے بھی
انہی تاریک غاروں کے طاق میں رکھے ہیں

اندھوں کی گواہی

ہم نے سنا تھا دنیا گول ہے
جو اَب رنگ، نسل اور مذہب کے چوکور خانوں سے نکل کر
انسانیت کے محور پر گھومتی ہے
غروبِ آفتاب کی سرزمینوں سے پھوٹنے والی روشنی نے
ہماری بے نور آنکھوں کو
چندھیا دیا ہے
ہم اپنے کانوں سے سنتے ضرور ہیں کہ
کل کسی بے بس ماں نے
اپنا موسیٰ نہر میں بہا دیا تھا
اور آج کوئی مرسی
انصاف کی دہلیز پر قتل ہو گیا ہے

کہنے کوتو یہ سات ارب کی دنیا ہے
مگراس میں انسانیت کا معیار
صرف سات فرعون ہی طے کرتے ہیں
باقی ساری دنیا اندھی ہے
اور اندھوں کی گواہی کون مانتا ہے

راوی

یہ منظر زیادہ قدیم نہیں ہے
شہر کے افق سے جب سورج نکلتا تھا
تو اس کی پہلی کرن مسجدوں کے میناروں سے ٹکراتی تھی
گردواروں، گرجوں اور مندروں سے ہوتی ہوئی
جب یہ کرنیں بیلوں کی گھنٹیوں تک پہنچتی تھیں
تو زندگی خدا کا شکر بجالاتی تھی
نئی صبح کی نوید
مذہبی پیشواؤں کی ہتھیلیوں سے دعا بن کر پھوٹتی تھی
مگر شہر کے افق پر منظر بدل چکے ہیں
اب عبادت گاہوں کے میناروں سے کہیں زیادہ
اور بلند و بالا موبائیل ٹاور ہیں
جن سے نکلنے والے واعظ سے
ہر دم ایک نیا دھرم وجود پا رہا ہے

اپنی سالگرہ پر ایک نظم

یہ چھیالیس سال
جو دنیا پر میں گزار چکا ہوں
ان کا ایک ایک پل میں نے
اس شجرِ ممنوعہ کی معاش میں
کاٹا ہے
جسے کھانے کی پاداش میں
میرے جد کو
جنت سے نکال دیا گیا تھا

کربلا

کوہِ طور اور جبل النور کی روایتیں
اگر چہ بہت قدیم نہیں
مگر ان پر ایمان روز بروز
کمزور ہو رہا ہے
کبھی کبھی میں سوچتا ہوں
اس جمہوری دنیا میں
تیرے ماننے والے اب اتنے لاغر ہو گئے ہیں
کہ وہ اپوزیشن کی طرح
صرف وعظ پر زور رکھے ہوئے ہیں
اور دوسری جانب شیطان کے پجاری
حکمرانی کے مزے لوٹتے ہیں

دنیا کو اپنے ضابطوں پر چلاتے ہیں
تیرے ماننے والوں کو
دار پر لٹکاتے ہیں
آگ میں جلاتے ہیں
پتھروں سے سنگسار کرتے ہیں
اور تیرے ماننے والے
اپوزیشن لیڈروں کی طرح منبر پر
پریس کانفرنسیں کرتے رہتے ہیں

ماضی

ایک کہانی ہے
بڑی پرانی ہے
دیو کی قید سے بھاگنے والے
پیچھے مڑ کر دیکھیں تو
پتھر ہو جاتے ہیں
آج برسوں بعد مجھ پر یہ کہانی کچھ اس طرح کھلی ہے
ہم سب کسی نہ کسی دیو کی قید میں ہیں
قید سے رہائی کے وقت
ہم سرپٹ بھاگتے ہیں مگر پیچھے دیکھنے کی
غلطی کر بیٹھتے ہیں
اور باقی ساری زندگی ہم دیو سے
مقابلے میں گزار دیتے ہیں

بلیک ہولز

انسان نے کھرب ہا سال کی دوری پر
ستاروں کو نگلنے والے
بلیک ہولز کی تصویر بنا ڈالی ہے
کائنات کے سربستہ رازوں کو
کھولنے والا انسان
اپنے اندر کے بلیک ہولز سے
ابھی تک بے خبر ہے
جو پہلے اس کی آرزوؤں کو
اور آخرکار اس کی روح کو نگل جاتے ہیں

ہمارے پاؤں ننگے نہیں ہیں

میرے کشمیریو
تم پہلی قوم نہیں ہو جو انتہا پسند ہندوؤں
کا نشانہ ہے
تم نے تاریخ میں پڑھا ہوگا
کہ 470ء میں سفید ہن ہندوستان آئے تھے
جنہوں نے بدھ تہذیب کا نام ونشان مٹا دیا تھا
حالانکہ سفید ہنوں کو بدھوں سے کیا خطرہ ہوسکتا تھا
وہ تو ننگے پاؤں پھرتے کہ کسی چیونٹی کا خون نہ ہو جائے
میں تمہیں بتاتا ہوں
کہ یہ سفید ہن تاریخ کا ایک سفید جھوٹ ہے
یہ انتہا پسند ہندو تھے جنہوں نے

بدھوں کی امن پسندی کا خون کیا تھا
ان کے شہروں اور خانقاہوں کو تاراج کیا تھا
میرے گندھارا اور تخت بھائی کے گلی کوچے اس کے گواہ ہیں
اب وہ تمہارے سری نگر کے درپے ہیں
میرے اسلام آباد پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں
لیکن وہ بھول رہے ہیں
یہ 470 عیسوی نہیں 2019ء ہے
اور ہم ننگے پاؤں نہیں پھرتے

نرگسیت

نوشتۂ دیوار بھی گویا
سرحد ہے
جس کے پار کے منظروں سے
ہم آشنا ہوتے ہوئے بھی
لاتعلّق رہتے ہیں
مگر ایک روز یہ دیوار
اپنے ملبے سمیت ہم پر گر جاتی ہے

چرخہ

دلکش منظر مجھے لبھاتے نہیں ہیں
دور کہیں اداسی
میرے اندر ٹھہری ہوئی ہے
دراز ہوتے ہوئے سائے
جب اندھیروں میں ڈھلنے لگتے ہیں
تو انجانا خوف
رات بن کر
مجھے سوت کی طرح کاتنا پڑتا ہے
جہاں چاند مجھے چرخہ کاتتی ہوئی بڑھیا
دکھائی دیتا ہے

خشوگی کے لیے ایک نظم

خشوگی
شاہوں سے پنگا لینا آسان نہیں ہوتا
اور شاہ بھی وہ جن کے قبضے میں
تیل کی دولت ہے
وہ تیل جس کے اوپر نیچے جانے سے
دنیا اوپر نیچے ہو جاتی ہے
خشوگی تم نے دیکھا ہوگا
ابھی چند ہفتے پہلے اسی شاہ نے
کینیڈا کے ساتھ کیا کیا تھا
ٹروڈو نے شاہ کو للکارنے کے بعد جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو
انسانی حقوق کے سبھی نام لیوا غائب ہو چکے تھے

مگر خشوگی
تم سے غلطی ہوئی
امریکہ جیسے سرمایہ دارانہ معاشرے میں رہنے کے باوجود
تم یہ نہیں سمجھ سکے کہ
دنیا میں کوئی اصول نہیں ہوتا

ٹاک شو

ہم بچے تھے تو
کتوں کی لڑائیوں کے بڑے بڑے پنڈال سجتے تھے
لوگ سیاہ اور سرخ رنگ کے خونخوار کتے پالتے
انہیں دیسی گھی، مکھّن اور بادام کھلاتے
جب وہ بہت زور آور ہو جاتے
اور چیر پھاڑنے کی للک
ان کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی
تو انہیں میدان میں اتار دیا جاتا
جہاں وہ طاقت کا نشہ اتارتے
یا کسی مخالف کے نشے کی بھینٹ چڑھ جاتے
عرصہ ہوا ہے

اب دیہات میں ایسے پنڈال نہیں سجائے جاتے
کیونکہ اب گاؤں والوں کو
کتوں کی لڑائیوں سے زیادہ مزہ
ٹی وی پر انسانوں کی لڑائیاں دیکھنے میں آتا ہے
جو کوٹ اور ٹائیاں پہنے
ہر روز سڑکوں پر پنڈال سجاتے ہیں
اور جس روز سڑکوں پر یہ منظر نہ ملیں
اس روز ہر ٹالک شو ڈاگ شو بن جاتا ہے

آگ کا دریا

جنت میں بہنے والی دودھ کی نہریں
جب دنیا میں پہنچتی ہیں تو
آگ کا دریا بن جاتی ہیں
جس میں نسلِ انسانی جل بُجھ کر
خاک ہوئی جاتی ہے

بے زیست لمحے

اے سالِ نو
تو نیا ہے نہ پرانا ہے
تیرے ساتھ بھاگتے بھاگتے
ہم نئے پرانے ہوتے رہتے ہیں
تیری صبحیں شامیں وہی ہیں
ان میں ہم
نئے منظر بناتے رہتے ہیں
جن میں رہنا نہیں وہ گھر بناتے رہتے ہیں
کبھی ہست اور کبھی نیست ہو جاتے ہیں
زندگی کی تلاش میں ہم
بے زیست ہو جاتے ہیں

آزادیِ اظہار

ننگ دھڑنگ
سردیوں سے ٹھٹھرتے اور گرمیوں سے جھلستے
انصاف اور مساوات کے لئے ترستے
مفلوک الحال لوگوں کا نوحہ
لکھنے میں مجھے پوری آزادی ہے
لیکن جب میں چمکتے دمکتے لباس والوں
یا جن کی قمیضیں ان کے پاؤں پڑتی ہیں
یا پھر جن کے لباس مٹیالے رنگ کے ہوتے ہیں
انہیں اس کا ذمہ دار لکھتا ہوں
تو میری انگلیاں قلم سمیت کاٹ دی جاتی ہیں

المیہ تو یہ بھی ہے کہ میرے ہم عصر
مجھے منصور حلاج قرار دے کر
میرے موت کے پروانے پر
دستخط کرنے کے لئے بے قرار ہیں

مغالطہ

آدم چُنیدہ تھے
برگزیدہ تھے
اپنی شریک حیات کی غلطی کی پاداش میں
صرف جنت سے نکالے گئے
مگر یہ آدمی ہے
جو دنیا کی دوزخ کو
ایک اور حوا کی آرزو میں
کاٹ رہا ہے

ویلنٹائن ڈے

مارکیٹ اکانومی
تونے یہ کیسا کمال کردیا
محبّت کوبھی پابندروز وشب
اور ماہ وسال کردیا
کسی شاہجہان کےتاج محل کی طرح
مفلسی میں پلتی کتنی محبّتوں کو
پامال کردیا، بےوصال کردیا

ٹریل فائیو

دامنِ کوہ پر تب بھی لوگ
قطار اندر قطار چڑھتے تھے
جب تیرے پہلو اور مارگلہ کے دامن میں
یہ حسین شہر آباد نہیں تھا
سنا ہے کبھی حق کی تلاش میں
مارے مارے پھرتے بھکشو
یہاں سے ننگے پاؤں گزرتے تھے
اور سادھو
یہاں سنیاس کرتے تھے
مگر وقت ایک سا نہیں رہتا

تیری پگڈنڈیاں اب بھی اسی طرح آباد ہیں
مگر ان میں رواں دواں جسموں کو
اب روح کی نہیں
جسم کی تازگی عزیز ہے

خطبہ

پیٹ پر پتھر باندھنے کی
روایتیں سنانے والے
میرے واعظوں کے
اپنے پیٹوں پر
آزار بند بھی مشکل سے ٹھہرتا ہے

تیسری دنیا

تیسری دنیا بھی گویا
تیسری جنس کی طرح ہے
چوکوں اور چوراہوں پر کشکول تھامے
اللہ کے نام پر مانگتی نظر آتی ہے
پہلی دنیا والے اس کے کشکول میں
بس اتنا ہی ڈالتے ہیں
جس سے اس کی سرخی پوڈر اور
دو وقت کا کھانا آ سکے
اور جب کسی بدقماش کی
وحشت حد سے بڑھ جائے تو
اپنی بھوک ان کے بدن نوچ کر پوری کر سکے

دو وطن

(دوست ساجد یوسف کے لیے)

مرے ہاتھوں میں سرخ پاسپورٹ دے کر
مرے آباء نے مجھے بتایا
کہ تم پاکستانی ہو
سکولوں اور کالجوں میں مجھے پڑھایا گیا
تم برطانوی ہو
یہ کشمکش سالہا سال سے جاری ہے
میں ہر سال بارود اور دھوئیں میں لپٹے ہوئے
لمحوں کو یاد کر کے
''وکٹری ڈے'' پر چرچل کو سلیوٹ کرتا ہوں
اور چودہ اگست کی لٹی پٹی ساعتوں میں
قائداعظم کے حضور ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں

پاکستان اور برطانیہ
میرے دماغ کے دو ایسے خانے ہیں
جو ''ونڈوز'' کے دو ''یوزرز اکاؤنٹس'' کی طرح کھلتے ہیں
جب میں پاکستان پر ''کلک'' کرتا ہوں تو
غربت، پسماندگی، جہالت، جنگ وجدل اور منافرت کے
تمام پروگرام کھل جاتے ہیں

اور جب میں برطانیہ پر ''کلک'' کرتا ہوں تو
نسلی تعصّب کی ''وائرس وارننگ'' کے ساتھ

وہ سب کچھ سکرین پر آجاتا ہے
جس کی تمنا کی جاسکتی ہے

مگر میرا المیہ یہ ہے کہ
آگے جانے کا ''پاسورڈ''
مجھے برطانیہ دیتا ہے نہ ہی پاکستان
میں ''ڈیسک ٹاپ'' پر کھڑا ہوں
کوئی مجھے آزاد کرے
اذنِ سفر دے

ٹلہ جوگیاں

یہاں کوئی دیوی تھی نہ دیوتا تھا
سب کا من ایک دوسرے سے بھاتا تھا
ہزاروں سال کے سفر سے
انسانیت مہر گڑھ، موہنجودڑو اور ہڑپہ تک پہنچی تھی
لیکن رفتہ رفتہ یہاں ویرانی چھانے لگی
لوگ اپنے نحیف بدنوں کے ساتھ
بچے کھچے مویشی لیے بھٹکتے رہے
انہی میں ایک بالک ناتھ سوکھی ندیوں کے ساتھ چلتے چلتے
دور کے پہاڑوں تک آن پہنچا تھا
پانی یہاں بھی نہیں تھا
وہ ایک اُونچے ٹیلے پر چڑھا

اور سورج کے سامنے پھیلاتے پھیلاتے ساکت ہو گیا تھا
ایک روز اس کی خشک ہتھیلیوں سے
پانی پھوٹ پڑا تھا
لوگ ان سوالی ہاتھوں پر نذر نیاز ڈالتے
اور بدلے میں امید لے کر جاتے

لیکن پھر ایک روز یہ جوگی مر گیا
پہاڑ پر جب اس کی سمادھی بنائی گئی
تو یہاں لاکھوں زائرین آتے
اور کروڑوں کے سکے چڑھاتے
جوگی اب نہیں تھا مگر امید کا سکہ
جوگ بن کر دنیا میں ہمیشہ کے لیے چل پڑا تھا

پُل صراط

سنا ہے جنت میں حوریں ہوں گی
شہد کی نہریں ہوں گی
یاقوت جیسے سندر
کافور سے مہکتے ممبر ہوں گے
نہ ماضی ہوگا نہ مستقبل ہوگا
حال ہوگا اور اس میں مست الست خیال ہوگا
دوسری جانب دوزخ ہوگی
جس میں پل صراط سے لڑھکتے
گناہ گار ہوں گے
آگ میں جلتے سنسار ہوں گے
صدیوں کے برابر ایک پل ہوگا

پہلے سے بدتر آنے والا کل ہوگا
پرانے صحیفوں میں پڑھا ہے کہ
ہمارے جد جنت سے نکال کر
دنیا کی اسی دوزخ میں ڈالے گئے تھے
جہاں ہر طرف آگ ہے
اور ہر پل
پُل صراط ہے

دیہاڑی دار

مزدور دیہاڑی دار نہیں ہوتے
بلکہ انہیں آنے والے کل پر
اس قدر پختہ یقین ہوتا ہے کہ
ایک ہی دن کی خوراک ذخیرہ کرتے ہیں
لیکن اصل دیہاڑی دار تو
وہ حاکم اور ان کے کاسہ لیس ہیں
جو اپنے کل سے خوفزدہ ہو کر
ہر روز قوم کے آج کو قربان کرتے ہیں
وہ دانشور بھی دیہاڑی دار ہیں
جن کے پیٹ ان کے قلم سے بھاری ہیں

فکری افلاس کے شکار

یہ دیہاڑی دار
کرونا سے بچ بھی گئے
تو تاریخ میں مر جائیں گے

المیہ

میں نے سنا تھا
کہ دوسروں کا گھر اجاڑنے والے کا
اپنا گھر کبھی شاد نہیں ہوتا
جو گڑھا دوسروں کے لئے کھودا جاتا ہے
اس میں بالآخر خود کو ہی گرنا ہوتا ہے
آج میرا گھر بے حال ہے
غموں سے نڈھال ہے
گڑھے کھودنے والے
خود ان میں گڑھ چکے ہیں
مگر المیہ یہ ہے کہ
نئے گڑھے کھودنے کا عمل ہنوز جاری ہے

زاویۂ نظر

انسان جیسے جیسے بالغ نظر ہوتا جاتا ہے
سب سے پہلے اس کی نزدیک کی نظر کمزور ہوتی ہے
تاکہ وہ چیزوں کی حقیقت کو پانے کے لئے
انہیں دور سے دیکھ سکے
اپنے آپ سے نکل کر دیکھ سکے

یہ جو دہشت گردی ہے

ہم نے زندگیاں ایسی سپاہ کے نرغے میں گزاری ہیں
جو کبھی ہماری سرحدوں کے اندر تو نہیں آئی
مگر اس کے بارود کی گھن گرج نے
ہماری راتوں کی نیندیں غارت کر دیں
ہمارے کھیتوں میں کھڑی فصلیں
جن پر کبھی فاختائیں پھڑ پھڑاتی تھیں
کوئلیں پیار کے گیت گاتی تھیں
وہ گولیوں کی تڑ تڑاہٹ سے خوف کھا کر
کہیں دور کے دیسوں میں جا بسیں
ہمارے کھیت اب بھی لہلاتے ہیں

مگران پر خوف و دہشت اُگتی ہے
اور ہم اس فصل کو کاٹتے اور کھاتے
عدم تحفّظ کی اس چار دیواری میں قید ہو چکے ہیں
جہاں سے آزادی کا کوئی راستہ نہیں ہے

آؤ جانور بن جائیں

آسٹریلیا تمہارے جنگلوں کو خاک ہوتا دیکھ کر
اور بے زبان جانوروں کی
سڑی ہوئی لاشیں دیکھ کر
میں رنجیدہ ہوں
میری طرح دنیا کے اربوں انسان تمہارے غم میں شریک ہیں
انہیں معلوم ہے کہ جنگل تم پھر اُ گا لو گے
مگر پچاس کروڑ جانور جو جان سے گئے
انہیں واپس نہیں لایا جا سکے گا
پہلی دنیا کی تیسری جانب
کشمیر ہے، فلسطین ہے، افغانستان ہے
جہاں کروڑوں انسان راکھ ہو رہے ہیں

ادھر ایک سلیمانی بھی
آسمان سے برستی آگ نے کوئلہ بنا دیا ہے
مگر پہلی دنیا
شاید صرف بے زبانوں کی زبان سمجھتی ہے
اس لیے آؤ
سب جانور بن جائیں

چوراہا

ایک چوراہے پر کھڑا اِک انجان مسافر
سوچے بھی تو کیا سوچے
دیکھے بھی تو کیا دیکھے
کہ ہر طرف ایک حصار ہے
زر کا دُعاؤں کا، محبّت کا، اناؤں کا
اور تو اور وہ خود بھی ایک حصار ہے
جائے تو کدھر جائے

امن کی آشا

(غزہ پر اسرائیلی حملوں کے پس منظر میں)

کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ
ہم گھروں کی حفاظت کے لیے
پھر سے کتے پال لیں
کتے کی وفاداری کی گواہ
صدیاں ہیں اور غاروں کی
وہ تاریک کوٹھریاں ہیں
جہاں انسان نے اپنا خوفزدہ ماضی گزارا تھا
گھروں کے ساتھ اگر سرحدیں بھی
کتوں کے حوالے کر دی جائیں تو
آئے روز کی گولیوں سے
بے گناہ انسان مرنا بند ہو جائیں
کیونکہ
امن کی امید اب کتوں سے ہی رہ گئی ہے

محبّت کی ایک نظم

چلی آؤ کہ
یہاں حبس کا موسم ٹھہر گیا ہے
سنا ہے تم جہاں سے گزرتی ہو
بہاریں وہاں رقص کرتی ہیں
ہوائیں تتلیاں اڑاتی ہیں
کالے بادل تمہاری زلفِ گرہ گیر کی لے میں
جب گھنگھور گھٹاؤں میں بدل جاتے ہیں
تو تمہارے پاؤں کی پازیبوں کی چھم چھم کی
تال پر برستے ہیں
ایک تمہارے چہرے کو شاداب کرنے کے لئے
پیاسی زمین کو سیراب کرتے ہیں

چلی آؤ کہ اب تو
دلوں میں بھی حبس کا موسم ٹھہر گیا ہے
ہاں ایک بات
اس بار تم مجھے ٹریل فائیو پر ملنا
کہ اوپر پہاڑوں میں
حبس ہے، دھواں ہے اور نجانے
کتنی محبّتیں جل بجھی ہیں

لاک ڈاؤن

زندگی کب سے لاک ڈاؤن میں تھی
محبّتیں قید تھیں
اور نفرتوں کو آزادی تھی
گلی گلی ناچتی اک بربادی تھی
امن پابند سلاسل تھا
اور جنگ سرِ عام تھی
سچ منہ چھپاتا تھا
جھوٹ کی تلوار بے نیام تھی
دوائیوں سے مارکیٹیں بھری پڑی تھیں
مگر کوئی مرض قابل علاج نہ تھا
کھیت لہلہاتے تھے

مگر غریب کی قسمت میں اناج نہ تھا
دشمن ابھی سرحد پر تھا
اور وہ اپنی ہی سپاہ کی زد پر تھا

وہ گھر جو کبھی آباد تھے
اب وہاں فساد ہی فساد تھے
انصاف کی تلاش میں نکلتے
سوالیوں کے لیے
جو اپنی مرضی کی زندگی کی خواہش کریں
ان جلالیوں کے لیے

اور ہم جیسے خام خیالیوں کے لیے
زندگی ہمیشہ سے لاک ڈاؤن میں تھی

جز دان میں لپٹے صحیفے

تاریخ بھی ہماری ڈائری کے
ایسے ابواب سے بنتی ہے
جسے ہم خود پڑھنے کی ہمت
پشیمانی کے ڈر سے نہیں کرتے
گزرے کل کے در اس واسطے وا نہیں کرتے
کہ کہیں ہم اپنی نظروں میں خود ہی گر نہ جائیں
لیکن جب ہماری زندگی کا باب بند ہو جاتا ہے
اور دہائیاں صدیوں میں بدل جاتی ہیں
تو ہماری نرگسی نسلیں
اس ڈائری کو تاریخی قرار دے کر

جز دان میں لپیٹ دیتی ہیں
جس پر اگر کوئی دوسرے قبیل کا فرد سوال اٹھا دے تو
یہاں بہنے والے پانیوں کا رنگ بھی
سرخ ہو جاتا ہے

سالِ نو پر ایک نظم

364 دنوں کا سفر دائروں کا نہیں
بدلتی رتوں کا بھی نہیں ہے
نہ ہی بدلتے زمانوں کا ہے
نیلاب سے مصر کے نیل تک
سورج نے کتنی ہی تہذیبوں کو خاک ہوتے دیکھا ہوگا
کتنی ہی بار زمین کو تہہِ آب ہوتے دیکھا ہوگا
اور آسمان سے برستی آگ کا مشاہدہ کیا ہوگا
کتنے ہی پیغمبروں کے وعظ سنیں ہوں گے
مخلوق کی پکار وہی ہے
زمین کا سفر بھی وہی ہے
سورج بھی وہی ہے

مگر اس کی روشنی ہمارے اندر کے گھپ اندھیروں کو
منور نہیں کر سکی
اگرچہ سورج کی کرنیں زمیں پر سونا کاشت کرتی ہیں
مگر ہماری نسلیں اس سونے کی تقسیم میں
دن کے اُجالوں میں
ایک دوسرے کے سر کاٹ دیتی ہیں
کیلنڈر نیا آجاتا ہے
ہماری تاریخ وہی رہتی ہے

فیض آباد دھرنا

مجھے نہیں معلوم
سوئی کے ناکے سے کتنے فرشتے گزر سکتے ہیں
مجھے تو اتنا پتہ ہے کہ
روز دفتر جاتے ہوئے ایک ناکہ آتا ہے
جہاں پولیس ہر گزرنے والے کو
دہشت گرد جان کر سونگھتی ہے
جس روز اس ناکے پر سپاہی نہ ہوں
اس روز یہ سڑک بند ہو جاتی ہے
لمبی لمبی داڑھیوں والے کہتے ہیں
یہ بارہویں صدی کا بغداد نہیں
اکیسویں صدی کا اسلام آباد ہے
اس ناکے سے فرشتے تو گزر سکتے ہیں
مگر کسی انسان کو گزرنے کی اجازت نہیں ہے

فاصلے ایسے بھی ہوں گے

وہ کہتا تھا
پانی اس صدی کا سب سے بڑا مسئلہ ہوگا
لوگ پیاسے مریں گے
دو گھونٹ پانی کے لیے
لوگ خون کی ندیاں بہائیں
مگر پانی پھر بھی نہیں ملے گا
میں نے کہا نہیں
اس صدی کا سب سے بڑا مسئلہ
محبّت ہوگی
جو نئی صدی کے کسی رشتے میں
نہیں ملے گی

عجب اپنا یہ دیس ہے

عجب اپنا یہ دیس ہے
جہاں بدلہ ہوا ہر ایک نے بھیس ہے
کسی کی شلوار کسی کا چولہ ہے
بھان متی نے غضب کھیل کھیلا ہے
باہر سے عاجزی کا پیکر
اور اندر انا پرستوں کا ٹولہ ہے
کرنے کے تھے جو کام وہ رہ گئے
کٹا ہر روز مگر نیا کھولا ہے
عوام ہیں فاقہ مست
ماشہ نہ کوئی دھیلا ہے
دربار شاہی میں ہر وقت

نشہ ہے، موج ہے، میلہ ہے
محل میں سر اور سنگیت
گلیوں میں فقط رولا ہے
ریاست ہے زور آور کی
ہر کمزور یہاں سوتیلا ہے
اپنا دیس یہ نرالا ہے

اجنبی راستے

تمہیں مجھ سے محبّت نہیں ہے
اور مجھے تم سے نفرت نہیں ہے
تو پھر کیوں نہ ہم
ایک دوسرے کے لیے
اجنبی بن جائیں
جیسے لوگ ایک دوسرے کی
غمی اور خوشی میں شریک ہوتے ہیں
لیکن نہ غم بانٹتے ہیں نہ خوشی
بس رسماً آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں
کیوں نہ ہم بھی
ایک دوسرے کے لیے
ایسے ہی اجنبی بن جائیں

سجاد اظہر کی نظم "ہم قرطبہ میں ہیں" گو بادی النظر میں عصرِ حاضر کے کرونائی بحران کی طرف اشارہ کرتی ہے مگر مطالعہ کرنے پر کھلتا ہے کہ دراصل یہ تو ذات کی دروں بینی ہے۔ یہ تو باطن کے طلسم کدے کا انکشاف ہے۔ نہایت پر اثر نظمیں منصۂ شہود پر آئیں۔ میں سجاد اظہر کو مبارکباد دیتا ہوں۔

وحید احمد

سجاد اظہر ایک متحرک، آمادہ اور بیدار شخص ہے۔ میری اس کی یاری کو چودہ برس سے زائد ہونے کو آئے جس کے دوران میں نے اسے بہت سے حالوں میں دیکھا ہے۔ اسے جو کچھ بھی آتا ہے اس میں وہ پکا ہے۔ اس کی شاعری اس کا کھویا ہوا ساتھی ہے جسے اس نے جستجو سے دوبارہ جا تلاشا ہے۔ جس طرح اس کی نثر محض لفظوں اور جملوں کا مجموعہ نہیں، ایک موقف اور ارادے کی اظہاریہ ہوتی ہے، ایسے ہی اس کی شاعری اس کے تاریخی اور سماجی شعور کی لفظی تجسیم ہے۔ یہ نظمیں بہت خلوص سے سوچی گئیں اور روح کی تڑپ کے ساتھ تارِ حرف میں پروئی گئی ہیں۔ معاصر نظم جیسے اور جیسے آہنگ دریافت کرتی چلی جا رہی ہے، ایک یہ بھی ہے جو اہلِ نظر سے توجہ چاہتا ہے۔

ڈاکٹر عابد سیال



لنڈی کوتل کی لالٹین کی اجلی روشنی میں وہ نثری نظمیں قلم بند کی گئی ہیں جن کا خمیر قدیم لوک دانش کی لوک زندہ روایت اور عصری آگہی کے امتزاج سے اٹھا ہے۔ ذیشان ساحل، عذرا عباس، نسرین بھٹی، تنویر انجم اور ثروت حسین نے نثری نظم کی صنف کو مستحکم کیا تھا۔ سجاد اظہر کی نظمیں اس میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ اپنی طیب دھرتی اور اس کے باسیوں سے جڑے لفظ ہی زندہ رہتے ہیں اور سجاد اظہر جیسے لکھاری ایک ایک لفظ کو اپنی مٹی کی امانت سمجھتے ہیں۔ سجاد اظہر کی نظمیں مکالمہ کرتی ہیں اور سوال اٹھاتی ہیں زندگی کی بے معنویت، ناہمواری اور بے ترتیبی پر، اس لیے مجھے اچھی لگتی ہیں۔ ایک تنبیہ، اگر آپ افسردہ ہونے سے گھبراتے ہوں تو اس کتاب سے دور رہیے گا۔

افتخار عارف

Misaal Publishers
misaal.publishers
+92-300-6668284
misaalpb@gmail.com